پروفیسر محمد منور

جہانِ اقبال - جہانِ قرآن

حضرت علامہ اقبال کے نزدیک حکمتِ قرآن لازوال ہے اور قدیم، اسے تا قیامت کارفرما رہنا ہے۔ یہ حکمت کسی خاص وطن کے باشندوں کی خاطر نہیں، کسی خاص نسل سے تعلق رکھنے والوں کے لیے نہیں، کسی خاص زبان سے وابستگان کے واسطے بھی نہیں، یہ سب کے لیے ہے، اس لیے کہ اصل آدم ایک ہے۔ مادّی اعتبار سے بھی ایک کہ سب مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور روحانی طور پر بھی ایک کہ ایک "ہی نفخ روح" کے مالک ہیں: ونفخت فیہ من روحی - بنو آدم کا ایک رشتہ آفاق سے ہے، ایک انفس سے۔ اور پھر لوٹ کر بھی سب کو ایک ہی مقام پر پہنچنا ہے اور وہ مقام ہے حضورِ ذاتِ حق جو خالق الاصباح، خالق الافلاک اور مالک یوم الدین ہے۔ واضح ارشاد ہے: "والیہ المصیر" گویا منبع بھی ایک، مورد بھی ایک، مبدا بھی ایک اور معاد بھی ایک۔ بقول سعدی:

بنی آدم اعضائے یک دیگرند ! کہ در آفرینش زیک جوہرند

حضرت علامہ اقبال وحدتِ مبدا حیات کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام سے بہت پہلے عیسائیت نے بھی انسان کو مساوات کا سبق دیا لیکن یہ امر کہ نوعِ انسانی ایک جسم نامی ہے۔ مسیحی روما کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ فلنٹ کہتا ہے زیادہ سے زیادہ جو بات کسی عیسائی یا دولتِ روما کے کسی مصنف کے حق میں بالخصوص کہی جا سکتی ہے، یہ ہے کہ اس کے ذہن میں وحدتِ انسانی کا ایک مجرد تصور موجود تھا مگر پھر رومی عہد سے لے کر اب تک بھی تو صورتِ حال کچھ ایسی ہے کہ یہ تصور یورپ کے دل و دماغ میں جاگزین نہیں ہو سکا۔ برعکس اس کے وطنی قومیت کے نشوونما سے جس کا سارا زور نام نہاد قومی خصائص پر ہے۔ وسیع انسانیت کا جو عنصر مغربی ادب اور فن میں کام کر رہا تھا برابر دب رہا ہے۔ لیکن اس سے کس قدر مختلف ہے عالمِ انسانیت کی تاریخ۔ یہاں وحدتِ انسانی کا خیال نہ تو محض کوئی فلسفیانہ تصور تھا، نہ شاعرانہ خواب، بلکہ روزمرّہ زندگی کا ایک زندہ اور قائم عنصر جو چپکے چپکے اور غیر محسوس طریق پر

اپنا کام کرتا رہا۔

اور ظاہر ہے کہ اس وحدتِ آدم کی منشوری دستاویز قرآنِ حکیم ہے اور قرآن جس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس سے قرآن اتارنے والے نے بھی یہی کہا تھا: قُلْ یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً۔[۵۲] (کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں)۔

منٹگمری واٹ لکھتے ہیں کہ موجودہ دنیا مادی اعتبار سے ایک ہو چکی ہے۔ اب وہی مذہب باعثِ کشش ہو سکتا ہے جس کے پاس پوری دنیا کے لیے پیغام ہو۔ اگر ہم اسلام کو اس زاویۂ نظر سے دیکھیں تو یہ پوری دنیا کا مذہب قرار پانے کے ناقابل نہیں ہے[۵۳]۔

اس سے اگلے صفحے ۲۸۴ پر منٹگمری لکھتے ہیں کہ کوئی لائحہ عمل واضح نہیں، شعور بھی نمایاں نہیں، کچھ صاف دکھائی بھی نہیں دیتا۔ اس کے باوصف محسوس یہ ہوتا ہے کہ اقوامِ عالم میں قرب باہم اور اتحاد و اختلاط کی جانب ایک حرکت سی ضرور موجود ہے۔ پھر صفحہ ۲۸۵ پر جو کتاب کا آخری صفحہ ہے اپنے اس عندیے کو دہراتے ہیں کہ عالمی معاشرے کو فقط کوئی مذہب ہی متحد اور ہم آہنگ کر سکتا ہے۔

صاف واضح ہے کہ جہانِ قرآن عرب کی حدود میں محدود نہیں، اسلامی معاشرے سے مراد محض عربی معاشرہ نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "الاسلام غریب" یعنی اسلام پردیسی ہے۔ پردیسی کا مطلب ہے کہ وہ کسی علاقے سے وابستہ نہیں۔ اگر وطن ہی دین کی اساس ہوتی تو ابوجہل ابولہب، ولید بن المغیرہ، عتبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف وغیرہ بڑے معتبر مکّی بھی تھے اور عربی بھی۔ مگر اسلام مکّی الوطن نہیں۔ بقول علامہ اقبال:

اگر دین از وطن بودے محمدؐ! ندا دے دعوتِ دیں بولہب را!

اور اگر دینِ اسلام مکی الوطن ہی ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکّے سے ہجرت نہ فرماتے۔ اس ہجرت نے واضح کر دیا کہ یہ دین علاقائی اور ارضی نہیں اور اسلامی معاشرہ اپنے خصائص کی رُو سے عام انسانی معاشروں سے مختلف ہے۔ حضرت علامہ کے بقول:

---

۵۱ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص ۲۱۵ ۵۲ قرآنِ حکیم، ۷: ۱۵۸

۵۳ اسلام: پنڈ دی انٹیگریشن آف سوسائٹی (لندن، طبع سوئم ۱۹۶۶ء)، ص ۲۸۳

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود [۴]

آپ نے [illegible] ہجرت [illegible] گویا ایک مستقل ترکیب [illegible]
ترتیب عمل [illegible] تو ان [illegible]
ہر وطن اسلام اسلام کی خاطر [illegible] ہے اور دین [illegible] علامہ
اقبال فرماتے ہیں [illegible]

[illegible] مسلم است [illegible]
معنی او از تنک آبی رم است [illegible] [۵]

یعنی ہجرت [illegible] کے باعث [illegible]
کو تقویت [illegible]
کیے کہ [illegible] گویا آپ نے ہجرت [illegible]
اور درس [illegible]

[illegible]

[illegible]
لیکن [illegible]
وہی [illegible] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]
وطن کو قربان کر دیں۔ مشرکین اور مستشرقین اپنی کوتاہ بینی کے باعث ہجرت کو فرار [illegible]
اگر یہ فرار تھا تو فتح مکہ کے بعد حضور [illegible] کیا مانع
تھی؟ اس [illegible] تو تمام [illegible]
ہاں مگر ترک وطن [illegible] ایک [illegible] آزمائش ہے تو دین کی خاطر عقیدے اور نظریے کی بنا پر
سوچ سمجھ کر ترک وطن، بڑا مشکل [illegible] ہے جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا [illegible]

---

[۴] رموز بیخودی، ص ۱۱۴

[۵] ایضاً

[illegible] أحبُّ شيءٍ إلى الله الغرباء۔ قيل مَن الغرباء؟ قال الفرّارون بدينهم يجتمعون إلى عيسى ابن مريم يوم القيامة[٥٦]

[illegible] اللہ کو پردیسی سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ پوچھا گیا کون سے پردیسی؟ ارشاد ہوا وہ لوگ جو دین کے بچاؤ کی خاطر بھاگے پھرتے ہیں، وہ قیامت کے روز عیسیٰ بن مریم کے درجے میں ہوں گے۔

"کون سے پردیسی" سے واضح ہے کہ ہر طرح کے پردیسی مراد نہیں ہو سکتے تھے۔ لوگ تجارت کی خاطر بھی پردیس جا نکلتے ہیں، تعلیم کے لیے بھی، شادی کے چکر میں بھی ترکِ وطن کر لیتے ہیں اور منصب و ملازمت کے سبب سے بھی۔ اس لیے حضورؐ سے وضاحت چاہی گئی اور آپ نے وضاحت فرما دی:

اتحادِ اسلام یہ تھا وطن کا مسئلہ، دوسرا مسئلہ نسل و نسب کا ہے۔ اس ضمن میں بھی حضورؐ کا سلوک عیاں ہے۔ جن لوگوں کو آپ نے مکہ میں چھوڑ دیا تھا وہ سب آپ کے خونی رشتہ دار تھے۔ مگر قرآن نے برادری کا تصور ہی نیا دے دیا تھا۔ جو اسلام قبول کرے وہ بھائی اور جو نہ کرے وہ غیر، گویا نسل کو الگ کر کے رکھ دیا گیا۔ جو مسلمان ہونے کے باوصف نسب و نسل کے بندھن سے آزاد نہ ہو وہ حضرت علامہ کے بقول اس ذہن و فکر کا مالک ہے جسے "نامسلم" ذہن و فکر قرار دیا جائے گا۔ ایسا فرد کوئی ہو، کہیں ہو، کسی بھی حیثیت کا مالک ہو۔ اس کی فکر، اس کا چلن مسلمانانہ قرار نہ پائے گا:

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب ... از قریش و منکر از فضلِ عرب!
در نگاہِ او یکے بالا و پست ! ... با غلامِ خویش بر یک خواں نشست!
[illegible] عرب نشناختند ... با کلفتانِ حبش [illegible]

احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند[٥٧]

صاف بات ہے کہ فلاں ابن فلاں ابن فلاں کہہ کر کسی کی رگِ رعونت پھولتی ہے تو یہ عمل وحدتِ آدم کے بنیادی عقیدے کے خلاف اور خلقکم من نفس واحدۃ (ہم نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا) کے منشا سے مزاحم ہے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ نے اپنا نسب نامہ بھی بتایا تھا کہ سلمان

---

٥٦ عبدالقاہر [illegible]: "عوارف المعارف" (بیروت)، ص ١٢٦۔ ٥٧ جاوید نامہ، ص ٥٥

ابن اسلام ابن اسلام تا آدم - جب اسلام ہی باوا بن گیا تو باقی آبا ایک طرف ہو گئے۔ قرآن کے پیشِ نظر جغرافیہ، نسل اور زبان نہیں، قرآن کے پیشِ نظر انسان ہے۔ اور اسلام جس کو اخوت کہتا ہے وہی اپنے ہمہ نوعی معنوں میں قرآنی تعلیم کا مغز ہے، یہ اخوت درحقیقت انسانیت کا شفقت آموز محبت آمیز نام ہے۔

قرآن قاطع نسب و نسل اصطلاحاً تو ہجرت ہی کے عمل سے ثابت ہو جاتا ہے مگر غزوۂ بدر نے اس ضمن میں لغوی مفہوم بھی بتا دیا۔ غزوۂ بدر کا فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کے علمبردار ایک اصولی برادری ہیں، ان کا رشتہ روحانی ہے۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر اُمت (ملت) ایک طرف تھی اور قوم دوسری طرف، قوم میں اہلِ مکہ تھے جو خونی رشتہ دار تھے۔ امت میں اکثریت ان کی تھی جو قریشی نہ تھے۔ کچھ وہ بھی تھے جو عرب ہی نہ تھے۔ مگر خون کی رُو سے اپنے کہلانے والے بیگانے ہو گئے اور جن سے خون کے بجائے روحانی اور ایمانی رشتہ استوار ہوا وہ یگانے ٹھہرے۔

ان دو مخالف صفوں کی کیفیت نرالی تھی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تھے اور آپؐ کے حقیقی چچا عباس بن عبدالمطلب اور آپؐ کے داماد (حضرت زینب کے خاوند) ابوالعاص اور چچازاد بھائی دوسری طرف، حضرت عمرؓ ایک طرف تھے اور ماموں دوسری طرف، حضرت علی ایک طرف تھے اور محسن چچا عباس اور بھائی عقیل دوسری طرف، حضرت ابوعبیدہ ایک طرف تھے اور ان کے والد جرّاح دوسری طرف، حضرت حکم بن سعید بن العاص ایک طرف تھے اور ان کا بھائی عبیدہ بن سعید بن العاص دوسری طرف، حضرت ابوحذیفہ ایک طرف تھے اور ان کا والد عتبہ بن ربیعہ دوسری طرف، حضرت صدیقِ اکبرؓ ایک طرف تھے اور ان کے فرزند عبدالرحمٰن دوسری طرف یہ سارے قریب ترین رشتہ دار تھے، باپ، بیٹا، بھائی، بھتیجا، چچا، ماموں، بھانجا، سسر داماد وغیرہ۔ مگر روح نے خون کو کاٹ کر الگ پھینک دیا۔ ملت نے قوم کو ہمیشہ کے لیے ٹھکرا دیا۔

باقی رہا لسان اور زبان کا عنصر جسے آج کل سیاسی اصطلاح میں کسی قوم یا قومیت کے بنیادی عناصر میں شمار کیا جاتا ہے تو حیاں ہے کہ اہلِ مکہ کی بھی وہی زبان تھی جس زبان میں قرآن نازل ہوا تھا اور پورے عرب میں قریش کی زبان کو مرکزی اور فصیح ترین زبان کا درجہ حاصل تھا۔ ابولہب اور اُمیہ اور اسی طرح دیگر کفار و مشرکین مکہ لغوی معنوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زبان تھے

مگر ہم مطالب نہ تھے۔ مختصر یہ کہ مادہ پرستوں کا نیشنلزم جن سہاروں پر استوار ہے اور جس نیشنلزم کے باعث نوعِ انسان نوعِ انسان کی شکاری ہے۔ قرآن اس فساد کو برباد اور اس شرارت کو غارت کرنے آیا تھا۔ قرآن نے رشتوں کی ساری نسبت ہی بدل دی، اور غرور و نخوت کے پیمانے ہی نئے وضع کر دیے۔ انسانی قرب اور برتری کے معیار نسب، نسل، لسان، رنگ، مال منال کی رُو سے قائم نہیں کیے جائیں گے بلکہ جو جتنا صاحبِ اتقا ہوگا اور بدی سے بچے گا، وہ خدا کے نزدیک اتنا ہی مکرم ہوگا۔ جو بدی سے جتنا قریب ہوگا اور اتقا سے جتنا عاری ہوگا۔ وہ خدا سے اتنا ہی دور ہوگا اور بے قدر۔ قرآن کے الفاظ میں :

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ [8]

اس طرح قرآن نے اولادِ آدم کی بلندی و پستی کے معیار بدل دیے، مادی معیارات کی جگہ روحانی اور اخلاقی معیارات نے لے لی۔ ہر قدر کو اخلاقِ آدمیت کے تابع کر دیا گیا۔ کسوٹی عمل کو قرار دے دیا گیا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کا قول ہے :

واللہ لئن جاءت الاعاجم بالاعمال وجئنا بغیر عملٍ فھم أولٰی بمحمد منا یوم القیامۃ۔ فان من قصر بہ عملہ لا یسرع بہ حسبہ [9]

بخدا اگر قیامت کے روز اہلِ عجم با عمل آئے اور ہم بے عمل پہنچے تو وہ ہمارے مقابل آنحضورؐ کے قریب تر ہوں گے۔ جو عمل کی رُو سے سُست ہوگا۔ اُسے حسب نسب کے باعث تیزئ رفتار حاصل نہ ہوگی۔

اصل فسادِ آدمیت آدم کی آدم ناشناسی ہے اور آدم ناشناسی کا نقطۂ آغاز آدم کی ناخود شناسی ہے۔ کوئی انسان مقامِ آدمیت سے ناآگاہ رہ کر یا غافل ہو کر درجۂ بہیمیت و وحشت سے بلند نہیں ہو سکتا۔ پھر جو جتنا زیادہ قوی اور زیادہ صاحبِ وسائل ہو اتنا ہی زیادہ بے درد اور خونخوار ثابت ہوتا ہے۔ یہ بہیمیت اور وحشت خصلت کی رُو سے چھوٹوں میں بھی پائی جا سکتی ہے اور بڑوں میں بھی، کمزوروں میں بھی اور زورداروں میں بھی۔ ہاں ضرر رسانی کی حدود کا دائرہ نسبت

---

[8] قرآنِ حکیم، ۴۹: ۱۳

[9] عباس محمود العقاد، حقائق الاسلام، (دارالکتاب العربیہ، بیروت)، ص ۲۷۷

[illegible] تنگ [illegible] ہو سکتی [illegible] اور غارت گری، طبقاتی کشمکش کا نتیجہ نہیں [illegible] [illegible] ہے جو [illegible] کا شعور اگر مجدود ہے تو اس [illegible] کو [illegible] جیسے [illegible] آتے [illegible]

انسانی اخلاق کے ضمن میں نا تربیت یافتہ شخص غریب ہو یا امیر اپنے اختیارات کو غلط طریقے ضرور استعمال کرے گا لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ آدمی کے مزاج سے حیوانیت نکال دی جائے اور یہ اس کی روحانی قوت کو بیدار اور یا اقتدار کیے بغیر ممکن نہیں۔ ہوس کی مادی بیماریوں کا کامل علاج مادی مداوے نہ کر سکیں گے۔ اصل میں ظلم و استحصال کا ذوق ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ طبقے بنیں گے، نہ ان کے مابین جنگ و جدال کا بازار گرم ہوگا۔ قانون اور آئین کتنا ہی سخت ہو اگر تربیت وہ نہ ہو جسے تربیتِ آدم کہتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر جسے تربیتِ اخلاق قرار دیا جاتا ہے صحیح نتائج برآمد نہ ہوں گے، قانون کا شکنجہ افرادِ معاشرہ کو شریف ظاہر کرے تو کرتا رہے، لیکن اگر وہ وحشی ہیں تو شکنجے کو ذرا کمزور پڑنے دیجیے، پھر دیکھیے اصلیت کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔ چند ہفتے گزرے کہ نیویارک میں ایک پوری رات بجلی بند رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کے اس بہت بڑے تمدنی مرکز میں آناً فاناً وحشت و بہیمیت کا بازار گرم ہوگیا۔ گھر لوٹے گئے، دوکانیں غارت ہوئیں، عصمتیں چھین لی گئیں، درجنوں عورتیں اٹھالی گئیں، قتل بھی عمل میں آئے، پولیس والے بھی مجروح و مقتول ہوئے۔ گویا بجلی کیا فیل ہوئی مہذب انسانوں کے اندر کی تاریکی باہر نکل کر کھل کھیلنے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ شرفِ انسانیت سے محروم سارے معاشروں کا امن و امان ایسا ہی ہے جیسے وحشیوں کو پنجروں میں بند کر دیا گیا ہو۔ ذرا پنجروں کے در کھولیے پھر تماشا دیکھیے۔ یہ فرق ہرگز نہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرے ہی میں ایسا ممکن ہے اور کمیونسٹ معاشرے میں ناممکن، شرط تو فقط شکنجہ ڈھیلا ہونے کی ہے۔ اس لیے کہ دونوں کے معاشروں کی اساس مادی ہے، مقابلہ مادی ہے، تصادم مادی ہے۔ ہوس کے آگے دونوں بے بس ہیں۔

لیوی کے بقول اس کے مقابل اسلام کے آئین کا ربط اصلاً اور اساساً اخلاق سے ہے، تمام ضابطے اخلاق پر استوار ہیں لہٰذا دیوانی جھگڑے ہوں یا فوجداری وہ محض قانون شکنی نہیں اور نہ محض احترامِ قانون۔ ان کے ساتھ نیکی اور بدی، ثواب و گناہ اور جنت و دوزخ کا تصور بھی

ہے ؎ اور حق یہ ہے کہ ایک [illegible] کے تصور کے بغیر جو قادرِ مطلق ہے [illegible] کے بلند
آخری حاکم بھی ہے [illegible] اخلاق عمل میں [illegible]
۔ فلاسفہ غور فرما سکتے ہیں۔ مگر خیر و شر کے [illegible] نہیں ہو سکتے، اور
بھی تو اخلاق کا تعلق عمل سے ہے، فلسفہ [illegible] نہیں ہے۔ اسلام میں ایک
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
لک نے اپنی زمین دینے سے [illegible]
ہے اس [illegible]
حضرت علامہ نے [illegible] جمال الدین افغانی [illegible]
خدا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ شریعت کے مطابق ظہور میں آنے والی [illegible]
شے ہے جس میں قیصریت و کسرائیت نابود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ مگر [illegible] انقلاب
نے کی ضرورت ہے اور وہ انقلاب خدا پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں، اس لیے کبریائی
لیت اور روشنی کے بغیر افکار بھی صحیح سمت کی جستجو میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بہرحال حضرت
نے مولانا جمال الدین افغانی کی زبان سے روس کو مخاطب کر کے کہا:

داستانِ کہنہ شستی باب باب ۔۔۔ فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

۱۰؎ روبن لیوی، سوشل سٹرکچر آف اسلام (کیمبرج ۱۹۶۵ء) ص ۱۹۲
۱۱؎ مصطفیٰ غالب: بسم اللہ الشد عہ و کفہ (۱۹۶۳ء) ص ۵۸-۵۹

با سیہ فاماں ید بیضا کہ داد ؟ مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد ؟
جز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر [12]

اگر عالمِ انسانیت کا مصدر ایک ہے، معاد ایک ہے، تو معاش ایک کیوں نہیں ؟ اور ان کی زندگی کے مسائل اور وسائل کو بھی تو کسی ایک ضابطے کا پابند کرنا ہوگا اور یقیناً وہی ضابطہ مفید اور کامیاب ترین قرار دیا جا سکتا ہے جو قرآن کی بنیادی اور اصولی ہدایات کے تحت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرمایا تھا اور جس میں آپ کے خلفائے راشدین نے پھیلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق وسعت دے کر آنے والی نسلوں کے لیے بڑے نمایاں خطوط متعین کیے اور خاکے بنائے تھے۔ لہٰذا عالمِ انسانیت کے لیے یہ بات قطعاً مفید نہ ہوگی کہ اُسے اخلاقی اور روحانی تعلیم تو قرآنِ کریم کی روشنی میں دی جائے اور اس کی معاش غیر قرآنی اصولوں پر استوار کی جائے۔ یہ تو قرآن پر جزواً ایمان لانے والی بات ہوئی۔ " افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض [13] "

عالمِ انسانیت جب عالمِ قرآن بنے گا تو انسان کے عذاب ختم ہوں گے اور وہ عالمِ قرآن کیا ہوگا؟ حضرت علامہ جمال الدین افغانی کی زبانی زندہ رود [14] کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

سوال زندہ رود :

زورقِ ما خاکیاں بے ناخدا است کس نداند عالمِ قرآں کجا ست

جواب افغانی :

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز !!! عالمے در انتظارِ قم ہنوز !
عالمے بے امتیازِ خون و رنگ شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید ! چوں دلِ مومن کرانش ناپدید

---

[12] جاوید نامہ، ص ۹۷-۹۸
[13] قرآنِ حکیم، ۲ : ۸۵
[14] زندہ رود حضرت علامہ خود ہیں - بالِ جبریل کے مرید ہندی کی طرح -

عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر !! تخمِ او افگند در جانِ عمر رضہ
لایزال و دارد آتش نو بنو ! برگ و بار محکماتش نو بنو
باطنِ او از تغیّر بے غمے ! ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے [۱۵]
دل بآیاتِ مُبیں دیگر ببند !!
تا بگیری عصرِ نو را در کمند [۱۶]

مختصراً یہ کہ وہ جہان یعنی جہانِ قرآن ابھی انتظار قم میں ہے۔ وہ جلوہ نمائی کے لیے بے تاب ہے۔ اس جہان میں رنگ و خون اور آقا و غلام اور شاہ و گدا کی تمیز نہ ہوگی۔ وہ عالمِ حسین جس کی ایک جھلک نے حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کو متغیر کر دیا تھا، وہ دائمی عالم جس میں نئے نئے جلوے اور نئے نئے تماشے جنم لیتے رہیں گے اور اس کی آیاتِ محکمات کی شان خوب سے خوب تر ہو کر سامنے آتی رہے گی۔ اس کے مبادی و اصول بڑے محکم ہیں، البتہ ہر خارجی تقاضے بدلتے رہیں گے اور وہ اصول ان خارجی تقاضوں سے بخوبی نمٹتے رہیں گے۔ عصرِ نو کی زمام جبھی تھام سکو گے کہ قرآن پر از سرِ نو بتمام و کمال عمل پیرا ہو جاؤ۔

حضرتِ علامہ نے ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں بھی:

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں !!

کا اسلوب اختیار کیا۔ جاوید نامہ میں جہانِ قرآن کا تصوّر حضرتِ جمال الدین افغانی کی زبانی واضح کرایا تو مجلسِ شوریٰ میں ابلیس کی زبانی اپنا یہ عقیدہ واضح کیا کہ اسلام ہی دنیا ئے آدم کا وہ دین ہے جس نے صحیح معنوں میں انسانی معاشرے کے اندر اخوت کی روح پھونکی اور ایک اصولی برادری کو جنم دیا۔ یہ وہ دین ہے جو پختہ اصولوں پر مبنی ہے بس کسر اتنی ہے کہ جن لوگوں کو اس دین کا حامل جانا جاتا ہے وہ خود غافل ہیں۔ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں، اس لیے کہ انھیں معلوم ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سلطانیِ لولاک کے لیے ابدی دستور عطا کر رکھا ہے۔ وہ دستور قرآن ہے جو بے مثال، مثالی سوسائٹی کی تعمیر کا واضح نقشہ پیش کرتا ہے، وہ سوسائٹی جس میں "آدمیت احترامِ آدمی" کی

۱۵؎ جاوید نامہ، ص ۶۷ ۱۶؎ ایضاً، ص ۶۸

روح اس اصول ہو۔ لہٰذا کوئی کسی کا حق نہ چھینے، کوئی کسی کو اپنے سے کمتر نہ جانے، کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ وہ سوسائٹی جس کے افراد ایمانِ محکم کی بدولت فقط اللہ سے ڈریں، موت کو خاطر میں نہ لائیں۔ حضرتِ علامہ نے ابلیس کی زبانی یہ بھی واضح کر دیا کہ اشتراکی نظریات کی اساس محض ایک ردِ عمل ہے، ایک ذہنی ژولیدگی ہے، ایک ہلچل ہے اور بس۔ یہ نظریات انسان کے دائمی ہمہ نوعی تقاضوں کا جواب نہیں:

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد!
یہ پریشان روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس اُمت سے ہے!
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے!!
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے![1]

ابلیس کی زبانی اشتراکیت پر یہ اجمالی تبصرہ کرا چکنے کے بعد اس کے مُنہ سے وہ اصول بیان فرمائے جن کا نفاذ انسانوں کو ہر ابلیسی دام سے نجات دلا سکتا ہے بشرطیکہ وہ حاملِ قرآن اور صحیح معنوں میں حاملِ قرآن ہوں:

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآن نہیں!
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں!

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف!
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر!!
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں!

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے!!
نے کوئی فغفور و سلطان نے گدائے رہ نشیں!

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف!
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

---

[1] کلیاتِ اقبال اُردو، ص ۵۴۶

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقین

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے!
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے![18]

آخری شعر میں یہ عجیب طنز پوشیدہ ہے کہ جس قرآن کی بدولت مسلمان کو دنیائے اقتدار کی زمام اپنے ہاتھ میں لینا تھی یہ اسی قرآن کو غلط سلط نئے معانی پہناتے اور اس کے باطنی مفاہیم تلاش کرنے کے شوق میں الجھ کر رہ گیا ہے اور اس طرح جہادِ زندگی سے فارغ ہوگیا ہے قرآن کے نام پر، قرآن جو جہادِ زندگی کا درس دینے والی کتاب ہے۔

محولہ بالا اشعار کی روشنی میں حضرتِ علامہ کا وہ بیان اور بھی بیّن اور صریح نظر آتا ہے جو انھوں نے ۲۴ر جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ "زمیندار" میں شائع کرایا تھا جس میں انھوں نے اس الزام کی تردید بالتاکید کی تھی کہ وہ بالشویک خیالات کے مالک ہیں۔ اس بیان کی آخری سطور یہ ہیں:

"مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا میں اسی نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں بن سکتے جب تک وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو ان کے طریقِ عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہوجاتے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کی اقتصادی تعلیم پر نظر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے"[19]

حضرتِ علامہ بالشویک خیالات کے مالک کیا ہوتے انھیں تو دکھ اس بات کا ہے کہ مسلمان خود یورپ کی پولیٹیکل اکانومی کے سطحی مطالعہ کے زور پر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہوجاتے ہیں۔ یونانی فلسفہ یورپ کے مزاج میں اس طرح داخل ہوا کہ مسیحیت بھی اس کا تدارک نہ کرسکی بلکہ

---

[18] کلیاتِ اقبال اردو، ص ۶۵۴، ۶۵۵

[19] گفتارِ اقبال، ۶ جنوری ۱۹۹۹ء، ص ۸۲

الٹا یونانیت کی نظر ہوگئی - یونانیت کا پیر تسمہ پا یوروپ کی ہمہ جہتی زندگی کے شانوں پر اس طرح پختگی کے ساتھ سوار ہے کہ اُترنے کا نام نہیں لیتا۔

مادّہ پرست یونانیت کا پیر تسمہ پا خود مسلمان مفکرین، عقلیتین اور فلاسفہ کے لیے بھی بہت سے معاملات میں الجھن پیدا کرنے کا باعث بن گیا، لہٰذا قرآن کی صریح تعلیمات، یونانی استدلال اور رویّہ و طرزِ عمل کی پیدا کردہ دھند میں دھندلانے لگیں - اس باب میں خود حضرت علامہ کی تشریح لائق ملاحظہ ہے - وہ کہتے ہیں :

"فلسفۂ یونان کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک زبردست ثقافتی قوت کی رہی ہے لیکن جب ہم علمِ کلام کے اُن مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں جن کا ظہور فلسفۂ یونان کے زیرِ اثر ہوا اور ان کا مقابلہ قرآنِ پاک سے کرتے ہیں تو یہ اہم حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ یونانی فلسفے نے مفکرینِ اسلام کے مطمحِ نظر میں اگرچہ کچھ وسعت پیدا کی مگر بحیثیت مجموعی قرآنِ مجید میں ان کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی - سقراط کی توجہ صرف عالمِ انسان پر تھی - اس کے نزدیک انسان کے مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے نہ کہ نباتات اور حشرات یا ستاروں کی دنیا - مگر اس سے کس قدر مختلف ہیں قرآنِ پاک کی تعلیمات، جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر شے بھی وحیِ الٰہی سے بہرہ ور ہوئی اور جس نے بار بار اس امر کی دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیّر و تبدل کا مشاہدہ کیا جائے - نیز دن رات کے اختلافات، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضائے لامحدود میں تیرتے پھرتے ہیں سقراط کے شاگرد رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے شدید نفرت رہی - اس کا خیال تھا کہ ادراک بالحواس سے کوئی علم تو حاصل نہیں ہوتا، تاہم اس کی بنا پر صرف ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے - برعکس اس کے قرآنِ مجید نے سمع و بصر کا شمار اللہ کے گراں قدر انعامات میں کیا اور عند اللہ اپنے اعمال و افعال کا جواب دہ ٹھہرایا - یہ وہ حقیقت تھی جسے شروع شروع کے مسلمانوں نے قرآنِ مجید کے مطالعے میں، یونانی ظن و تخمین سے مسحور ہو کر نظر انداز کر دیا - بہ الفاظ دیگر انھوں نے اس کا مطالعہ بھی فکرِ یونان کی روشنی میں کیا اور پھر کہیں دو سو برس میں جا کے سمجھے اور وہ بھی پورے طور پر نہیں کہ قرآن پاک کی روح اساساً یونانیت کے منافی ہے"[۲۵]

---

[۲۵] تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص ۵ - ۴

یونانیت کا ایک یہی نقص کیا کم ہے کہ خدائے واحد کا واضح تصوّر نہیں ابھرتا۔ یونانیوں کا خدا بے بس سا خدا ہے۔ وہ محرّک غیر متحرک ہے۔ وہ ایک بار کائنات کی مشین کو چالو کر کے بیٹھ رہا ہے۔ وہ حاکم ہے، بے حدود قلمرو کا مالک ہے مگر بے اقتدار ہے، ایسا خدا مجیب الدعوات نہیں ہو سکتا جبکہ قرآن کا خدا دعا قبول کرتا ہے: "اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ"[۲۱] پھر یہ کہ یونان کا خدا فاطر السموات و الارض نہیں، یعنی وہ خلاّق نہیں جس نے عدم سے وجود پیدا کیا۔ یونانیت کا تصوّرِ خدا خلاّقی کی صفت سے تقریباً خالی ہے اس لیے کہ یونانیت بالعموم مادّے کو بھی ازلی مانتی ہے، گویا خدا نے مادّے سے اسی طرح کام لیا جس طرح بڑھئی لکڑی سے کام لیتا ہے۔ بڑھئی لکڑی کو مختلف صورتیں عطا کر سکتا ہے مگر وہ لکڑی کا خالق نہیں۔ خلاّق اور صناع میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کے خدا نے نہ صرف یہ کہ ہر شے پیدا کی اور کیے جا رہا ہے بلکہ ہر شے کا ایک ضابطہ، اندازہ، قاعدہ اور تخمینہ بھی مقرر کر دیا ہے جس کے مطابق ہر شے کو اپنی تکمیل کرنا ہے اور اپنی تقدیر حاصل کرنا ہے:

"اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ"[۲۲]

"سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"[۲۳]

ہر شے کو اپنی تکمیل کے لیے سرگرم رہنا یا اپنی تقدیر کو حاصل کرنے کے درپے رہنا ظاہر کرتا ہے کہ ہر شے کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔

"مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ"[۲۴]

کائنات کی تخلیق محض کھیل تماشے کی بات نہیں جیسا کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ دیوتاؤں نے اپنے دل بہلاوے اور تفریح کی خاطر یہ کھیل پیدا کر دیا ہے جس کو دنیا کہتے ہیں۔ اس طرح آدمی گویا محض ایک "کردار" ہے۔ اسے ایک رول دے دیا گیا ہے اور اس میں اس کی اپنی مرضی اور اپنے انتخاب و اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا اگر اس کی جواب دہی ہو گی تو اس عالم میں کہ اس کے بس میں کچھ بھی

۲۱۔ قرآنِ حکیم، ۲: ۱۸۵
۲۲۔ ایضاً، ۷: ۵۴
۲۳۔ ایضاً، ۵۷: ۱
۲۴۔ ایضاً، ۲۱: ۱۶

نہ تھا لیکن قرآن کا انسان عقل و دانش کے درجے کے مطابق جواب دہ ہے اور ہر ایک کو اپنا اپنا حساب جدا جدا دینا ہے۔ "وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا"[۲۵] خواہ کسی فرد کا عمل اس کی انفرادی حیثیت سے زیادہ تعلق رکھتا ہو یا اس کی اجتماعی حیثیت سے مگر جزا و سزا کے لیے اس کو اکیلے ہی حاضر ہونا ہوگا۔

محمود العقاد کہتے ہیں: "اسلام انسان کے گلے میں کسی موروثی گناہ کا طوق نہیں ڈالتا۔ کسی کو اپنے والد کی جگہ حساب نہیں دینا پڑتا۔ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ مسلم کا ایمان ہے کہ اسے کسی کمتر مخلوق میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ انسان کا بلندی کی طرف سفر یا پستی کی جانب انتقال اس کی اپنی ذمہ داری ہے۔ یہ اس کی اپنی "تکلیفِ امانت" ہے۔ وہ تکلیف کے بلند ترین مقامات پر پہنچنے کی اہلیت کا مالک ہے اور اسفل السافلین تک بھی گر جانے کی قابلیت رکھتا ہے۔ یہ "تکلیفِ امانت" اُسے ایک طرف فرشتوں سے اونچا لے جاتی ہے اور دوسری طرف شیطان کے زمرے میں نیچے جا پھینکتی ہے"[۲۶]

غرض کہاں خدائے یونان اور کہاں خدائے قرآن ۔ خدائے قرآن آدم کو درجۂ عقل و بینش کے مطابق اور اہلیت و اختیار کے موافق ذمہ دار فرد اور مختارِ وجود قرار دیتا ہے جسے اپنی ہمت سے اپنی تکمیل کرنی ہے۔ اور جہان قرآن ہی درحقیقت وہ جہان ہے جس میں انسان اپنی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں بروئے کار لا سکتا ہے۔ لیوی لکھتے ہیں:

"انسان کی زندگی کا مقصد و مدعا تکمیل حاصل کرنا ہے۔ یہ مقصد ایسا ہے کہ انسان کے اپنے دائرۂ اختیار میں ہے اور اگر وہ اپنے خیالات و تصورات کو اپنی قدرت اور صلاحیت کے مطابق عمل میں ڈھال لیتا ہے، تو درجۂ کمال حاصل کر لیتا ہے"[۲۷]

اور تکمیل آدم کی صورت ہے "تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ" اللہ کے اخلاق اپنانا اور اللہ کے رنگ میں رنگے جانا۔ اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے۔

---

۲۵ قرآن حکیم، ص ۱۹ : ۹۵

۲۶ حقائق الاسلام، ص ۱۰۹، ۱۱۰

۲۷ سوشل سٹرکچر آف اسلام، ص ۲۲۹

"صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً" ۳۸ اور اللہ کے اوصاف اس کے اسمائے حسنہ ہیں جو شاہد ہیں اس کی غفاری، قہاری، رحم، رحمت، قدرت، کرم، احسان، عفو، عدل، حکمت، رُشد، حلم، لُطف، سلام، جمال، جلال وغیرہ پر۔ ان صفات کو اپنا کر انسان اپنے اندر وہ توازن اور قوت پیدا کر سکتا ہے جو اُسے صحیح معنوں میں مردِ مومن اور مردِ کامل بنا دے۔ یہ یونان کے مادہ پرست نظریات پھر کر کسی فوق البشر کا تصور تو پیش کر سکتے ہیں مگر خیر البشر کا تصور ان کے بس کی بات نہیں۔

حضرتِ علامہ دانشِ فرنگ کے خلاف اگر فریاد کرتے ہیں تو اسی لیے کرتے ہیں کہ فرنگ کے یونان گزیدہ افکارِ جدیدہ آدم کو مقامِ آدم سے آگاہ نہیں ہونے دیتے۔ اور آدم مقامِ آدم سے کیوں کر آگاہ ہو جب تک خدائے واحد کی "شانِ احدیت" واضح طور پر متصور نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ حضرتِ علامہ مادی قوت رکھنے والے یورپ کے نظریات میں پوشیدہ زہر کو دیکھ رہے تھے اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ یورپ کی مادی قوت اور شان وشوکت یورپ کے غلاموں اور دیگر پس ماندہ معاشروں کو مرعوب کر رہی ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کو جو یورپ کے جھوٹے نگوں کو موتی جان کر مہنگے داموں خرید رہے تھے۔ انہی جھوٹے نگوں میں یورپ کی پولیٹیکل اکانومی کے نام نہاد ترقی پسند اصول بھی تھے اور انہی میں لینن اور کارل مارکس کے افکار بھی تھے۔ جبھی تو انھوں نے کہا تھا:

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں!!! ۔۔۔ کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف یونانی افکار کے تجاوزات ہی تھے جن کی طرف شعر ذیل میں تفسیر رازی کو علامت بنا کے اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کا مطلب ہے کہ روحِ قرآن اور اصلِ قرآن کی صداقت کو دیکھیے، یونانی منطق وکلام وفلسفہ سے متاثر مفسرین وشارحین کی نکتہ آرائیاں اور موشگافیاں ایک طرف رکھ دیجیے:

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فروشستم ۔۔۔ اسرارِ جہاں دیدم پنہاں بکتاب اندر!

مگر یہ جملہ مطالب جو آدم کو فی الحقیقت آدم بنانے کے ضامن ہیں عقلِ مغرور کی سمجھ میں نہیں آتے۔ یونانی فلسفے اور اس کی موجودہ فکری ذریت کا ایک وصف اور ہے، وہ یہ ہے کہ وہ قلب کو کھا جاتی ہے اس لیے کہ وہ عقل ہی کے خیالات ومشاہدات کو سب کچھ جاننے لگتی ہے۔ حضرت علامہ کو

---

۳۸ قرآنِ حکیم، ۲: ۱۳۸

عقل سے کوئی عداوت نہیں، وہ عقل کو اللہ کی بہت بڑی دین جانتے ہیں۔ وہ عقل کو نور قرار دیتے ہیں۔ البتہ ہر شے کی ایک حد ہے۔ ایک درجہ ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ عقل ہی سب کچھ نہیں۔ کوئی اور شے بھی ہے۔ جو عقل سے بہت آگے لے جاتی ہے۔ اور وہ شے قلب ہے۔ قلب وجدان کا مصدر ہے۔ اور قلب وحئ الٰہی کا مہبط ہے۔ عقل کی نظر محدود ہے، قلب کی نظر غیر محدود ہے:

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دل بینا بھی کر خدا سے طلب!　　آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

آدم کے مسائل محض مادی نظریات پر چلنے والی دانش یا محض عقل کے بس کا روگ نہیں۔ آدم محض مادی وجود نہیں۔ اس کے مادی وجود کی زندگی تو پلک جھپکنے کے برابر ہے۔ اس کی روحانی زندگانی لافانی ہے جو شب و روز کے پیمانے سے ناپی نہیں جا سکتی، لہٰذا خالق ہی کے دستور کے مطابق آدم کی تربیت ہو سکتی ہے اور وہ دستور بھی خالی عقل کی مدد سے بخوبی سمجھا نہیں جا سکتا۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (کیا یہ لوگ قرآن کے ضمن میں غور و تدبر نہیں کرتے کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے دلوں کو قفل لگ گئے ہوں؟

سیدھی سی بات ہے کہ آدم اپنا خالق خود نہیں۔ لہٰذا ہزار وہ اپنے نفسیاتی اور عضائی تجزیے کرتا رہے۔ ہزار تاریخ و آثار کا مطالعہ کرے۔ ہزار اپنے کمالاتِ فن پر تنقید و تبصرے فرمائے حقیقتِ آدم دسترس سے دور ہی رہے گی۔

انسان اندرونی طور پر لامحدود وجود ہے۔ اُسے وہی جانتا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے جس کا دعویٰ ہے اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا) ۔ حق یہ ہے کہ وہی جانتا ہے اور اسی کے بھیجے ہوئے نسخۂ کیمیا کی روشنی میں آدم کو ہمہ جہتی تربیت بھی میسر آ سکتی ہے، مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی تسکین اور اطمینان بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ جہانِ قرآن ہی صحیح معنوں میں جہانِ انسان ہوگا، ورنہ آدمی کے اپنے بنائے ہوئے آئین و دستور غیر متوازن اور غیر متناسب ثابت ہوتے رہیں گے اور آدم بار بار وحشت اور بہیمیت کی جانب لوٹتا رہے گا:

چوں مسلماناں اگر داری نظر
در ضمیر خویش در قرآں نگر　　طا ۴۷: ۳۴